انور سدید

خلیل الرحمٰن اعظمی کے خطوط قاضی نذیر احمد کے نام

پروفیسر قاضی نذیر احمد جو گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہونے کے بعد، جناب مجیب الرحمان شامی کے ماہ نامہ ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے، میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ انھوں نے میٹرک کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ عمرانیات میں داخلہ لیا تھا اور اس دوران میں ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو وہ واپس اپنے شہر چنیوٹ آ گئے تھے۔ لیکن میں ان کے علی گڑھ کے دوستوں کے بارے میں لاعلم تھا۔ ایک دن ''قومی ڈائجسٹ'' کے دفتر میں ''ترقی پسند تحریک'' کے موضوع پر بات چیت شروع ہو گئی اور میں نے خلیل الرحمان اعظمی کی کتاب ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کا ذکر کیا تو قاضی نذیر احمد بولے ''خلیل الرحمان اعظمی علی گڑھ میں میرے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اور پاکستان آنے کے بعد بھی ان سے خط کتابت جاری رہی۔ ان کے چند خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔'' میں نے ان خطوط میں دلچسپی ظاہر کی تو قاضی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے یہ خطوط ڈاکٹر معین الرحمان کو پیش کر دیے تھے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ قاضی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے یہ خطوط لا کر مجھے دکھائیں گے۔ میرے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ اعظمی صاحب کے یہ خطوط جو قعرِ گمنامی میں ڈوبے ہوئے ہیں، منظرِ عام پر لائے جانے چاہئیں کہ ان خطوط سے ان کے کردار کی چند کرنوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ماہ نامہ ''قومی ڈائجسٹ'' کی ترتیب و تدوین میں قاضی نذیر احمد اور یہ ناچیز انور سدید، جناب مجیب الرحمان شامی کی معاونت کرتے تھے۔ اس ماہ نامے کے دفتر میں میری ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی اور ہم اپنے اوقاتِ کار کے چھ سات گھنٹے اکھٹے گزارتے تھے۔ اب میں نے قاضی صاحب سے ان خطوط کا تقاضہ شروع کر دیا تو انھوں نے بھی یہ خطوط ڈاکٹر معین الرحمان سے واپس لینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ایک دن بڑی مایوسی سے کہنے لگے ''ڈاکٹر معین صاحب شاید یہ خطوط واپس نہیں کرنا [چاہتے]۔ لیت ولعل سے کام لے رہے ہیں۔ ان کے دولت کدے پر جاتا ہوں تو اچھی چائے پلانے کے بعد بات ٹال جاتے ہیں۔'' یہ بات سن کر میں نے سوچا کہ کسی دن معین الرحمان صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہو کر یہ خطوط دیکھ لوں گا۔ مجھے اطمینان تھا کہ یہ خطوط اب غیر محفوظ ہاتھوں میں نہیں ہیں اور کسی روز معین الرحمان صاحب انھیں ضرور منظرِ عام پر لے آئیں گے۔'' اب میں نے روز روز کا تقاضہ ترک کر دیا۔ ایک دن قاضی صاحب فاتحانہ شان سے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے:

''لیجیے۔ خلیل الرحمان اعظمی کے چار خطوط مل گئے ہیں''

میں نے یہ خطوط اپنے بریف کیس میں رکھ لیے اور قاضی صاحب سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنے تعلیمی دور اور خلیل الرحمان اعظمی سے اپنی دوستی کی باتیں سنائیں۔ قاضی صاحب نے جو کچھ کہا، وہ ان کی زبان سے سنیے:

''۱۹۴۵ء میں جب میٹرک کے بعد میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا کر ایف اے میں داخلہ لیا تھا تو

میں نے اپنے مضامین میں عربی کو بھی منتخب کیا تھا۔ عربی ہمیں جناب بدرالدین علوی پڑھایا کرتے تھے۔ عربی کی کلاس میں طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے ایک دوسرے سے شناسائی آسانی سے ہوگئی۔ ایک دن دیکھتے ہیں کہ ایک نئے صاحب کلاس میں آئے۔ معلوم ہوا کہ سائنس کے مضامین چھوڑ کر آرٹس میں آئے ہیں اور عربی مضمون رکھا ہے۔''

''اور یہ تھے۔ خلیل الرحمان اعظمی''۔ آہستہ آہستہ تعلق بڑھا تو اعظمی صاحب کو ادبی ذوق سے بدرجہ اتم سیر پایا۔ پھر تو یہ روزانہ کا معمول ہوگیا کہ میں عصر کے بعد وی، ایم، ہال سے چلتا اور اعظمی صاحب کے پاس ماری سن کورٹ پہنچتا اور شام تک ہم ایک طویل سیر کرتے۔ زیادہ تر مباحث ادبی ہوتے تھے۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کا دور دورہ تھا۔ ن۔ م۔ راشد کی کتاب ''ماورا'' کا بڑا چرچا تھا۔ اسرارالحق مجاز اور فیض احمد فیض کے اشعار طلبا کے ورد زبان رہتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ماحول بہت متنوع قسم کا تھا۔ ہر ذوق کے مطابق طلبا مل جاتے اور دوست بن جاتے تھے۔ مشاعرے ہوتے، ادبی مباحثے ہوتے، سیاست اور مذہب کی عظیم ادبی شخصیات علی گڑھ آتیں اور طلبا سے خطاب کرتیں۔ مختلف صوبوں کے طلبا کا اکٹھے رہنا بڑا عجیب لیکن دل کش لگتا تھا۔''

''خلیل الرحمان اعظمی کی شخصیت ان سب میں اپنی الگ انفرادیت رکھتی تھی۔ ایف اے کی درسی تعلیم کے دوران میں ہی وہ اردو اور انگریزی ادب کے شاہ کاروں کا مطالعہ کر چکے تھے اور صرف مطالعہ ہی نہیں وہ ادب کے ان شاہ کاروں پر اپنی تنقیدی اور تجزیاتی رائے بھی پیش کرتے تھے۔ انگریزی ادب میں انھوں نے ہارڈی کے تمام ناول پڑھ ڈالے تھے اور شام کی سیر میں وہ ان کے انفرادی گوشوں پر روشنی ڈالتے اور اپنی اختلافی رائے بھی ابھارتے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ دوسروں کا اختلافی نکتہ غور سے سنتے، لیکن اپنے نکتے سے الگ رائے پیش کرنے والوں کا برا نہ مناتے۔ اپنے علم و فضل پر انھوں نے کبھی تکبر کا اظہار نہیں کیا اور اپنے خیالات کے اظہار میں ہمیشہ عجز و انکسار کا اظہار کرتے۔ ایک اور خاص بات جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی یہ تھی کہ وہ نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تعلیمی اخراجات کے لیے انھیں گھر سے مالی معاونت نہیں ملتی تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے واجبات ___ ''فرائض سوسائٹی'' سے قرضِ حسنہ لے کر ادا کیے، اور داخلہ لیا تھا۔ مگر مجال ہے کہ ان دو برسوں میں انھوں نے اپنی عسرت کے ذاتی حالات کا کبھی تذکرہ کیا ہو۔ خودداری ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ سیر کے بعد ''کیفے ڈی جمیل'' میں چائے ضرور پیتے۔ اور اس کے بعد ہم اپنے اپنے ہوسٹلوں کی طرف چلے جاتے۔''

''خلیل الرحمان اعظمی کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ یونیورسٹی لائبریری میں رسائل اور اخبارات آتے تھے۔ شام کو بھی لائبریری کھلی رہتی تھی۔ اعظمی صاحب رات گئے تک مطالعے میں مستغرق رہتے۔ ان دنوں کلکتہ سے ایک اخبار ''عصرِ جدید'' نکلتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ادبی بحث میں ایک مضمون میں نے بھی لکھا۔ یقین نہیں تھا کہ شائع ہوگا۔ اس لیے میں اسے بھول گیا۔ ایک دن میرے ہاں آتے ہی اعظمی صاحب نے کہا ''تم تو چھپے رستم نکلے۔ مضمون شائع کرایا اور مجھے پتا ہی نہیں کہ تم اتنے اچھے ادیب بھی ہو!'' اور پھر انھوں نے اسی اخباری مضمون کی اتنی تعریف کی کہ میں شرمندہ ہوگیا۔ اب ان کے کردار کے اس زاویے پر سوچتا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ''ترقی پسند'' ہوتے ہوئے بھی عام ترقی پسند ادیبوں سے بہت مختلف تھے۔''

''۱۹۴۷ء میں خلیل الرحمان اعظمی انتہا پسند ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچ نہ سکے۔ وہ ریل میں سفر کر رہے تھے کہ چند شر پسندوں نے انھیں مسلمان ہونے کے ناتے اٹھایا اور ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ وہ زخمی ہوگئے۔ لیکن جان بچ گئی۔ تین ماہ تک

علاج ہوتا رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ایک نظم لکھی جس کی پاداش میں جیل بھی جانا پڑا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے کرنے کے بعد انھیں فوری طور پر ملازمت نہ مل سکی۔ کچھ عرصہ نہایت عسرت میں گزارا۔ لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ آخر یونیورسٹی میں لیکچرر شپ ملی تو کچھ سکون حاصل ہوا۔''

''تقسیم ہند کے بعد میں واپس پنجاب آ گیا۔ فیصل آباد (سابقہ لائل پور) سے بی۔اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کیا۔ اس اثنا میں اعظمی صاحب کی غزلیں ''ادبِ لطیف'' لاہور میں چھپتی رہتی تھیں۔ جب کوئی غزل چھپتی تو میں ان کو خط لکھ دیتا تھا۔ اور وہ بھی جواب دیتے تھے جس کا ذکر ان کے خطوط میں بھی موجود ہے۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے مجھے اپنی شادی پر مدعو کیا مگر میں نہ جا سکا۔ ۱۹۵۸ء میں اپنی شادی پر انھیں بلایا تو وہ بھی نہ آ سکے۔ لیکن ''سہرا'' لکھ کر بھیج دیا، جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

نوید آئی ہے یارب! کس کی تقریب عروسی کی
کہ کلیاں خود چمن کی آرزو میں بن گئیں سہرا

یکم جون ۱۹۷۸ء کا دن تھا۔ میں ریڈیو پر دہلی اسٹیشن سے ''اردو سروس'' کا پروگرام سن رہا تھا کہ اعلان ہوا۔ ''ممتاز شاعر اور نقاد خلیل الرحمان اعظمی انتقال کر گئے''۔ سن کر بہت افسوس ہوا۔ خلیل الرحمان اعظمی صرف اکیاون سال کی عمر میں راہیِ ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ میں اپنے ذاتی تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ مشاہدے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اعظمی صاحب شاعری اور تنقید کے میدان میں ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جو انھیں ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے وہ محض شاعر اور نقاد نہیں تھے بلکہ وہ کئی عظیم انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ بڑوں سے سیکھتے تھے چھوٹوں کو شفقت اور پیار سے سکھاتے تھے۔ نہ کسی سے رقابت نہ دشمنی، مگر اپنے اصولوں کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ جب ترقی پسند تحریک میں سیاسی نعرے بازی شروع ہو گئی تو خلیل الرحمان اعظمی اس تحریک سے بیزار ہو گئے لیکن ان کا اعزاز یہ ہے کہ انھوں نے نیاز فتح پوری جیسے عظیم نقاد سے اپنی زندگی میں داد و تحسین حاصل کی۔''

''علی گڑھ سے آنے کے بعد ہمارے مابین خط کتابت عرصے تک جاری رہی۔ مگر میں زیادہ خطوط باترتیب انداز میں محفوظ نہ رکھ سکا۔ اعظمی صاحب میں دوستی کو خلوص سے نبھانے کا جذبہ موجود تھا اور یہ خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں میرے جیسے معمولی شناسا سے بچھڑ جانے کا بھی بہت غم تھا جس کا حوالہ انھوں نے فراقؔ کے ایک شعر سے بھی دیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ''آسماں اے آسماں'' ایک کتاب ہندوستان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک مضمون ڈاکٹر اخلاق احمد کا چھپا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے دل میں ادب کا ذوق و شوق پیدا کرنے اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے لانے والے خلیل الرحمان اعظمی تھے اور ان کے فیضان سے ہی انھوں نے ڈاکٹریٹ کی اور اب اس یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے کردار کا یہ پہلو کتنا تابناک ہے۔۔۔ اور اب میں اعظمی صاحب کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''یوں تو مرنے کے لیے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے ہم نے''

قاضی نذیر احمد نے اپنی بات ختم کی تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی یادوں نے انھیں افسردہ کر دیا تھا۔ انھیں دکھ اس بات کا بھی تھا کہ وہ ۱۹۴۷ء کے بعد دوبارہ علی گڑھ نہ جا سکے اور ایک دفعہ بچھڑے تو خلیل الرحمان اعظمی کو پھر نہ دیکھ سکے۔ انھیں ملال تھا کہ اعظمی صاحب کے خطوط کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ وہ وثوق سے کہہ رہے تھے کہ یہ

خطوط ضائع نہیں ہوئے۔ کاغذات کے پلندوں میں کہیں ضرورت سے زیادہ محفوظ ہو گئے ہیں لیکن اب انھیں تلاش کرنا ممکن نہیں۔ میں نے غنیمت سمجھا کہ ان سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے چار قدیم ترین خطوط مل گئے۔ ان کے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کا عنوان ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' تھا۔ ''مقدمہ دیوان آتش'' نے انھیں بہت شہرت دی۔ تنقیدی مضامین کی دو کتابیں ''زاویۂ نگاہ'' اور ''مضامینِ نو'' شائع ہوئیں، شاعری کی کتابوں میں ''کاغذی پیرہن'' اور ''نیا عہد نامہ'' شامل ہیں۔ ان کی آخری دستیاب تحریروں میں ان کا ''کتبہ'' بھی شامل ہے۔

شکستہ ہو چلے اب بادباں سفینے کے
مرے لہو کا سمندر بلا رہا ہے مجھے
مری رگوں میں مچلنے لگے ہیں وہ قطرے
جو دودھ ماں نے مجھے پیار سے پلایا تھا
نہ رت جگوں کی وہ دستک، نہ نیند کی آہٹ
بس اک سکوتِ صدا ہے جو مجھ سے رہ رہ کر
یہ کہہ رہا ہے کہ لو آ رہی ہے منزلِ شب
مرے رفیق، مرے ہم سفر، کہاں ہیں سب
کوئی تو جائے، کہے، ان سے یہ پیامِ مرا
کہ ایک کتبہ بنائیں مری لحد کے لیے
ہو درج جس پہ کہ جو شخص سو رہا ہے یہاں
کہ اپنا دوست تھا۔ پر اس کا کوئی نام نہ تھا''

اور اب ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی کے چند دستیاب خطوط بنام قاضی نذیر احمد ملاحظہ فرمایئے۔

مکتوب (۱)

۱۶ فروری ۴۹ء

خلیل الرحمان اعظمی
سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین۔ علی گڑھ
۶۔ امیر نشاں، سول لائنز۔ علی گڑھ

عزیز دوست، کچھ دنوں پہلے تمہارے دو کارڈ ایک ساتھ ہی ملے تھے۔ جن کے پڑھنے کے بعد جو خوشی حاصل ہوئی اسے بیان نہیں کر سکتا۔ ان خطوں کا کتنا ممنون ہوں جس (کذا) نے مجھے ایک بچھڑے ہوئے ساتھی سے ملا دیا۔ مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب تم وی۔ ایم۔ ہال سے ماری سن کورٹ مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اور ہم دونوں ساتھ گھومنے جایا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد چاہے دوسروں کو کتنا ہی فائدہ حاصل ہوا ہو لیکن ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ہمارے درمیان ایک

دیوار حائل ہوگئی۔ نہ جانے کتنے ساتھیوں کو اسی طرح تقسیم نے ایک دوسرے سے دور کر دیا ہوگا۔

۱۶ راگست کے بعد مجھ پر کیا گزری؟ یہ ایک مفصل کہانی ہے۔ بس اتنا سن لو کہ دہلی کے فسادات میں، زخمی کر کے ٹرین سے پھینک دیا گیا تھا۔ آٹھ زخم آئے تھے۔ تین ماہ ہسپتال میں رہا۔ اس کے بعد پھر علی گڑھ آیا۔ اس وقت سے یہیں پر ہوں۔ اب کی بار میں ہوسٹل میں نہیں رہتا۔ بلکہ معین احسن جذبی صاحب، جو اردو کے لیکچرر ہیں، ان کے ساتھ رہتا ہوں۔

بی۔ اے میں میرے پاس فلسفہ اور اکنامکس ہے۔ امتحان بہت قریب ہے۔ لیکن پڑھائی لکھی (کذا) کچھ نہیں ہوئی ہے۔ دعا کرو کہ کامیاب ہو جاؤں۔ میرا امتحان ۱۶ اپریل سے ہوگا۔

میں نے ادھر بہت سی نظمیں لکھیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئیں، مارچ کے ''ادب لطیف'' میں بھی ایک نظم شائع ہو رہی ہے۔ تمھاری نظر سے گزرے گی۔

اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں۔ وہاں تمھاری زندگی کیسی گزر رہی ہے۔

تمھارا: خلیل

مکتوب (۲)

۶ مئی ۱۹۵۰ء

۵ حالی روڈ، علی گڑھ

میرے بہت اچھے دوست! عرصہ کے بعد تمھارا ایک خط رشید صاحب کی معرفت ملا۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی۔ تمھاری صورت اس وقت آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہی معصومیت، وہی سادگی، میرے ساتھ تمھارا بے پناہ انس اور لگاؤ۔ پاکستان، خدا اسے سلامت رکھے، تقسیم نے دوستوں کو ایسا دور کر دیا کہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے ترس گئے ہیں۔ بقول فراقؔ

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دور بسائی ہیں بستیاں

میرے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ میری مٹی علی گڑھ کی تھی۔ اور یہیں ٹھکانے لگی۔ اس خاک سے وابستہ ہو گیا ہوں۔ اور اس جزیرے کی زندگی سے اپنا دل لگا لیا ہے۔ آج کل شعبۂ اُردو میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔

میری نظموں کا مجموعہ ''کاغذی پیرہن'' اس وقت پریس میں ہے۔ جولائی (کے) ہفتے تک شائع ہو جائے گا۔ تمھیں ایک کاپی بھیجوں گا۔ فی الحال میری تصویر سے دل بہلاؤ اور ہو سکے تو اپنا ایک نیا فوٹو بھیج دو۔

ہمیشہ تمھارا
خلیل الرحمان اعظمی

مکتوب (۳)

۱۳ اگست ۱۹۵۷ء

آنند بھون۔ سول لائنز، علی گڑھ

محبِ عزیز! تمھارے خطوط تعطیلات کے زمانے میں یہاں آئے۔ میں ادھر برابر سفر میں رہا۔ بروقت جواب نہ دے

سکا۔تمھارے خلوص نے تو واقعی مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں اپنی بے پروائی کی وجہ سے تمھارے خطوں کا پابندی سے جواب نہیں دیتا۔لیکن تم نے اپنی محبت میں کمی نہیں کی۔تمھارے کردار کا یہ رخ بڑا دل کش ہے۔ بہر حال جہاں رہو،خوش رہو۔دوست! میں تم کو بھولا نہیں ہوں۔ابھی تک علی گڑھ کی وہ صحبتیں آنکھوں میں سو رہی ہیں۔دنیا بہت بدل چکی ہے۔تمھارا معصوم چہرہ ابھی تک مجھے یاد ہے۔

تمھارے مشاغل آج کل کیا ہیں؟ یہ خط تمھارے گھر کے پتے پر لکھ رہا ہوں۔خدا کرے مل جائے۔جواب جلد دینا۔

تمھارا اپنا خلیل الرحمان اعظمی

کارڈ پر پتہ انگریزی میں یوں ہے: قاضی نذیر احمد۔ایم۔اے۔محلّہ ڈھگی پار۔چنیوٹ۔ضلع جھنگ (پاکستان)

مکتوب (۴)

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء

آنند بھون،سول لائنز،علی گڑھ

پیارے نذیر!

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں مع اپنی بیوی کے کشمیر چلا گیا تھا۔وہاں سے واپس آیا تو ڈاک کے ڈھیر میں تمھاری شادی کا دعوت نامہ بھی رکھا ہوا ملا لیکن اس وقت تم اپنی شادی کر کے اپنی بیوی کے ساتھ کسی خوشگوار مقام پر 'ہنی مون' منا رہے ہو گے۔ میں نے سوچا کہ اب میں مبارک باد دے کہ تمھیں کیوں 'بور' کروں۔پھر کئی بار خط لکھنے کا خیال آیا۔مگر اپنی مصروفیتوں کے سبب بات ٹلتی رہی۔اب تم نے اس خط میں جس محبت اور خلوص سے یاد کیا ہے۔اس پر میں شرمندہ ہوں۔واقعہ یہ ہے کہ تم جس قدر مجھے چاہتے ہو،اتنی ہی میری طرف سے غفلت ہو جاتی ہے۔حالانکہ اس میں میری بد نیتی کو دخل نہیں۔میں تمھاری معصوم محبت کی بہت قدر کرتا ہوں۔تم جو تلاش کر کر کے میری تحریریں پڑھتے اور انھیں سراہتے ہو،اس سے دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ چلو اپنا ایک قدر دان تو ملا ہے۔''فکر و فن'' میں تمھیں نہ بھیج سکا جس کا افسوس ہے۔پبلشر نے دس کاپیاں دی تھیں،یہیں کے ساتھیوں کی نذر ہو گئیں۔ادھر انجمن ترقی اردو نے میری کتاب ''نوائے ظفر'' شائع کی ہے۔اسے بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

تم کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے میری کتاب ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' پر مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ایک اور کتاب ''مقدمہ کلام آتش'' یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔یہ چیزیں چھپ جائیں تو تمھاری نذر کروں گا۔

سرگودھا کا ماحول کیسا ہے۔تم نے..... کیے یا نہیں۔ازدواجی زندگی کیسی رہی۔

تمھاری بھابی تمھیں آداب کہتی ہے

تمھارا اپنا: خلیل

(نوٹ: اس خط کے آخری جملے کے چند الفاظ پانی لگنے سے مٹ گئے ہیں۔)

(الف۔سین)